علامہ اقبال کے سفر یورپ پر جانے سے قبل اور بعد کے زاویے کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ

A Research and Analytical Study of Allama Iqbal's Perspective Before and After His Journey to Europe

Aainy Syed
M.Phil. Research Scholar, Institute of Islamic Studies,
My University, Islamabad
Email aainysyed9020@gmail.com

Abstract
Allama Iqbal, whom the world knows as the poet of the East. You are recognized as distinguished and great among the poets of the 20th century, not only in your era but also today, in terms of your unique style of thought. Because you were not only a poet but also a great thinker, philosopher, broad-minded Islamic thinker and the founder of the idea of Pakistan. Just as there are different periods of physical development in human life, in the same order, the intellectual and conscious development of man also continues. Similarly, the process of change and change in Allama Iqbal's thoughts is due to the political conditions, social conditions and western concepts of his time. The negative side which is revealed in Hawan's poetry during his travels to Europe for higher education is prominent. Accordingly, historians and analysts associate the periods of Allama Muhammad Iqbal's life with the periods of his poetry.
In this article, a research and analytical study of the stages of Allama Iqbal's intellectual evolution is being presented. To understand that what fruits were obtained from the thoughts and ideas of Allama in his time and is it possible to cure the ill health of contemporary Muslims with these ideas even today?
Keywords: Allama Iqbal, journey to Europe, pre-European perspective, post-European perspective, research study, analytical study, philosophical impact, intellectual development, cultural influences, poetry evolution.

موضوع کا تعارف

علامہ محمد اقبالؒ جنھیں دنیا شاعر مشرق کے نام سے جانتی ہے۔ آپ بیسویں صدی کے شعراء میں اپنی منفرد فکری انداز کے اعتبار سے نہ صرف اپنے دور میں بلکہ آج بھی ممتاز اور عظیم تسلیم کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ آپ صرف شاعر نہ تھے بلکہ ایک عظیم مفکر، فلسفی، وسیع البصیرت اسلامی مدبر اور نظریہ پاکستان کے بانی بھی تھے۔

انسانی زندگی میں جیسے طبعی طور پر جسمانی نشو نما کے مختلف ادوار ہیں اسی ترتیب سے انسان کی عقلی اور شعوری نشو نما بھی ہوتی رہتی ہے۔ ایسے ہی علامہ اقبال کے افکار میں تغیر و تبدیلی کا عمل ان کے دور کے سیاسی حالات، معاشرتی حالات اور مغربی تصورات کے منفی پہلو جو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ کے سفر کے دوران ان پر منکشف ہوئے ان کی شاعری میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی اعتبار سے مورخین اور تجزیہ نگار علامہ محمد اقبال کی زندگی کے ادوار کو ان کی شاعری کے ادوار سے منسلک کرتے ہیں۔

اس مضمون میں علامہ اقبال کے اسی فکری ارتقا کے مراحل کا تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ علامہ کے فکر و نظریات سے ان کے دور میں کیا کیا ثمرات حاصل کیے گئے اور کیا آج بھی ان نظریات سے دور حاضر کے مسلمانوں کی زبوحالی کا علاج ممکن ہے؟

ضرورت و اہمیت

اس عنوان پر مضمون لکھنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کیونکہ آج کا مسلمان علامہ کے دور کے مسلمانوں کی طرح ذہنی غلامی کا شکار ہے، حالانکہ آج وہ اقبال کے دو قومی نظریہ کی روشنی میں آزاد اسلامی ملک کا باشندہ ہے۔ مگر افسوس پاکستان آزاد وجود کا مالک تو بنا مگر خود مختار نہیں بن سکا۔ کیونکہ مخلص رہنما آزادی کے بعد تشکیل مملکت کے ابتدائی مراحل میں ہی دنیا سے چلے گئے اور ان کے بعد آج تک ہماری قوم اقبال کا مومن کامل پیدا نہ کر سکی جو امیر کارواں بن کر اس ملک کے وجود میں لائے جانے کا مقصد پورا کرتا۔ لہذا اس دور کے آرام پسند نوجوانوں میں اقبال کی خودی کی تپش پیدا کرنے کے لیے اقبال کے نظریات کو دور حاضر کے مسائل کے حل کے لیے عصری موافقت کے انداز میں سامنے لانے کی کوشش ہے اس امید کے ساتھ ''شاید کے تیرے دل میں اتر جائے میری بات''(1)

سابقہ تحقیقی کام کا تجزیہ

سابقہ تحقیقی کام میں علامہ اقبال کے یورپ کے سفر سے پہلے اور بعد کے فکری ارتقا پر جزوی توجہ دی گئی ہے، جہاں تصورِ خودی، اسلامی اتحاد، اور مغربی تہذیب پر تنقید جیسے موضوعات کو نمایاں کیا گیا، لیکن ان کے فکری تغیرات کا جامع اور تقابلی تجزیہ کمزور رہا۔ یہ تحقیق ان تشنہ پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے اقبال کے فکری ارتقا کو یورپ کے سفر کے اثرات کے تناظر میں سیاسی، سماجی، اور فلسفیانہ زاویوں سے تفصیل سے بیان کرے گی۔ مزید برآں، اقبال کے نظریات کو موجودہ دور کے مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے عملی طور پر پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی، جو سابقہ تحقیقات میں نمایاں طور پر نظر نہیں آتی۔

منہج تحقیق

اس تحقیق میں علامہ اقبال کے یورپ کے سفر سے قبل اور بعد کے افکار کا تقابلی اور تجزیاتی مطالعہ کیا جائے گا تاکہ ان کی فکری تبدیلیوں کے اسباب اور اثرات کو سمجھا جا سکے۔ تحقیق کا مقصد اقبال کے نظریات کو عصر حاضر کے مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے پیش کرنا ہے۔ معیاری اور تاریخی تحقیقی طریقہ کار کے تحت اقبال کی کتب، شاعری، خطوط، اور معتبر ثانوی ذرائع کا تجزیہ کیا جائے گا۔ تحقیق میں اقبال کے تصورِ خودی، مغرب پر تنقید، اور اسلامی اتحاد جیسے موضوعات کا مطالعہ شامل ہو گا۔ نتائج کی روشنی میں اقبال کے افکار کی عصری اہمیت اور عملی رہنمائی کے لیے تجاویز پیش کی جائیں گی۔

علامہ اقبال کا تعارف

ڈاکٹر علّامہ محمد اقبال بیسویں صدی کے اردو اور فارسی زبان کے ایک معروف شاعر تھے۔ شاعری میں بنیادی رجحان تصوف اور احیائے امت اسلام کی طرف تھا۔ بحیثیت مصنف اقبال نے اپنی تحریروں اور شاعری میں اپنے افکار کے ذریعے ہندوستان کے مسلمانوں میں ذہنی غلامی سے آزادی کے حصول کا جذبہ پیدا کیا اور نظریۂ پاکستان کی صورت میں منزل دیکھائی۔ قانون دان، سیاست دان اور نوجوانوں کے رہنما کی حیثیت سے آپ تحریک پاکستان کی اہم ترین شخصیات میں سے ایک تھے۔

نجی زندگی

شیخ محمد رفیق، کشمیر کے سپرو برہمنوں کی نسل کی ایک اسلام قبول کرنے والی شاخ سے تعلق رکھتے تھے، کشمیر سے سیالکوٹ ہجرت کی اور یہی پر ان کی نسل پروان چڑھی۔ ان کے بڑے بیٹے شیخ نور محمد اور دوسرے بیٹے شیخ غلام محمد تھے- 9 نومبر 1877 کو شیخ نور محمد کو اللہ نے ان کے خواب کی تعبیر کے طور پر ایک بیٹا عطا کیا[(2)(3)]۔ جن کو دنیا ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے نام سے جاننے لگے۔

۔ اقبال بچپن ہی سے شعور، سمجھ بوجھ اور ذہانت میں اپنے ہم عمر بچوں سے بہت آگے تھے۔ کھیل کود میں بھی حصہ لیتے تھے۔ بچوں کی طرح شوخیاں بھی کرتے تھے۔ اور حاضر جواب بھی بہت تھے۔ اقبال کے والد ان باتوں پر روک ٹوک نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو بچے کی شخصیت کے نکھارنے کے لیے ضروری اور مفید مانتے تھے۔ اقبال کے اندر احساسات اور فکر کی وجہ ان کے دل اور عقل کی ایک ہی حدف پر یکسوئی ہے اور اس کی وجہ صوفی باپ اور عالم استاد کے زیر سایہ فطری کشادگی اور بے ساختگی کے ساتھ گذرا ہوا بچپن ہے۔

تعلیمی دور

شیخ نور محمد باعمل مسلمان تھے اس لیئے اقبال کی تعلیم کی ابتدا حسبِ دستور قرآن شریف سے مولانا غلام حسن کی شاگردی میں ہوئی۔ ایک سال بعد اقبال کو دینی اور جدید تعلیم کے لیے شہر کے ایک نامور عالم مولانا سید میر حسن کے شدید اصرار پر ان کے زیر تربیت دے دیا گیا۔ ان کی شاگردی میں اقبال نے تین سال اردو، فارسی اور عربی ادب پڑھا۔ پھر سید میر حسن کے اسکاچ مشن اسکول میں پڑھانے کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد اقبال بھی وہی داخل ہو گئے اور وہی سے 6 مئی 1893ء میں اقبال نے سولہ سال کی عمر میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور تمغہ اور وظیفہ حاصل کیا اور 1895ء میں اقبال نے ایف اے بھی کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی، فلسفہ اور عربی میں 1898ء میں بی اے پاس کیا اور مارچ 1899ء مین پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ (جو بعد میں واپس انگلینڈ چلے گئے) کی شاگردی میں ایم اے فلسفہ میں پنجاب بھر میں اوّل پوزشن حاصل کی۔ دسمبر 1905ء کو علامہ اقبال نے اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج یونیورسٹی ٹرنٹی کالج انگلستان میں داخلہ لے لیا۔ جہاں کے استادوں میں وائٹ ہیڈ، میگ ٹیگرٹ، وارڈ، براؤن اور نکلسن شامل تھیں۔ تقریبا ایک مہینہ بعد بیرسٹری کے لیے لنکنز اِن میں داخلہ لے لیا جو جولائی 1908ء کو مکمل ہو گیا۔ جولائی 1907ء کو ہائیڈل برگ سے جرمن زبان سیکھ کر میونخ یونیورسٹی سے آپ نے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1908ء میں یہ تحقیقی مقالہ "ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقا" کے عنوان سے پہلی بار لندن سے شائع ہوا۔ 25 جولائی 1908ء کی رات دہلی واپس پہنچے۔

اقبال کے فکری ارتقا کے مراحل

ذہنی ارتقاء عمر کے ساتھ ساتھ ہر انسان کی ہوتی ہے، لیکن فکری ارتقاء ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے۔ اس سے مراد فکر کا منطقی طور پر اپنی اندرونی حرکت سے وقت کے ساتھ ساتھ بننا۔ اس میں ضروری ہے کے پہلے سے موجود خیال کے ساتھ اگلا خیال منطقی طور پر مربوط ہو۔ اس کو فلسفہ کی زبان میں Internal Movements of Thoughts کہتے ہیں۔ یہ فکری ارتقاء اقبال کے ہاں زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ فلسفہ کے طالب علم تھے، دوسری وجہ ان کے دور میں نئے نئے علمی رجحانات سامنے آرہے تھے۔ اور تعلیمی سفر کے سلسلے میں ماحول میں تبدیلی ہوتی رہی۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اقبال کے فکری ارتقاء کے پہلے دور میں جب انھوں نے شعر گوئی کی اس میں اقبال کا رجحان فطری تھا۔ ان کا ہر موضوع فطرت کے گرد ہی گھوم رہا ہے۔ اور وہ انگریزی رومانوی کلام سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ واضح ہو کہ اقبال فطرت پسند تھے فطرت پرست نہیں۔ پھر جلد ہی ان

کا رجحان بدلا اور ان کی شاعری کا موضوع رومانیت سے تسخیر فطرت بنا۔ پھر اقبال کے سفر یورپ کے ساتھ ہی ان کی فکری نشو و نما کے دور اولین کا اختتام ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد قیام یورپ کے دوران اور یورپ سے واپسی کے بعد ان کی فکر میں جو ارتقائی تبدیلیاں واقع ہوئیں ان تینوں ادوار کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

سفر یورپ سے قبل علامہ اقبال کے فکری زاویے

اقبال کی فکری نشو و نما کا پہلا دور ان کی ابتدائی زندگی سے لے کر 1905 میں لندن جانے سے پہلے کا دور ہے۔ اگر چہ اقبال کی ذہنی نشو و نما تحصیل علم کے مختلف مدارج میں مختلف مراحل سے گزرتی رہی لیکن زندگی کے ابتدائی ادوار میں جہاں ان کی روحانی تربیت کا سامان ان کے والد کی طرف سے ہو رہا تھا وہاں ان کی سیرت و کردار کی تعمیر میں ان کی والدہ محترمہ کی تربیت کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔ اقبال اخری عمر میں فرمایا کرتے تھے:

"میں نے اپنا نظریہ حیات فلسفیانہ جستجو سے حاصل نہیں کیا، زندگی کے متعلق ایک مخصوص زاویہ نگاہ ورثے میں مل گیا تھا، بعد میں میں نے عقل و استدلال کو اسی کے ثبوت میں صرف کیا ہے۔۔"(4)

در حقیقت والدین ہی انسان کے سب سے پہلے معلم ہوتے ہیں۔ انسان اپنی ماں سے شعوری اور غیر شعوری طور پر جو کچھ حاصل کرتا ہے اس کے نقوش بہت ہی گہرے اور انمٹ ہوتے ہیں۔ اگر چہ اقبال کی ذہنی نشو و نما تحصیل علم کے مختلف مدارج میں مختلف مراحل سے گزرتی رہی لیکن زندگی کے ابتدائی مدارج میں جہاں انہیں ایک طرف روحانی بالیدگی کا سامان اپنے والد ماجد سے ملا وہیں دوسری طرف ان کی سیرت و کردار کو ایک خاص نہج پر ڈھلنے میں ان کی والدہ محترمہ کی تربیت کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے ذہنی بلوغت کے اعلیٰ مدراج پر پہنچنے کے بعد بھی اپنے جوہر کمال کو اپنی ماں کی اعلیٰ تربیت کا مرہون منت قرار دیا ہے:

تربیت سے تری میں انجم کا ہم قسمت ہوا　　گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزّت ہُوا
دفتر ہستی میں تھی، زریں ورق تری حیات　　تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تری حیات"(5)

مولوی میر حسن جیسے فاضل استاد نے اقبال کو فارسی نظم و نثر کے شاہکار کتب: گلستان بوستان اور سکندر نامہ زمانہ طالب علمی ہی میں اس طرح پڑھائے کہ ذہین طالب علم نہ صرف فارسی ادبیات کی عظمت کا قائل ہو گیا بلکہ مزید مطالعہ کا شائق بھی۔ ساتھ ہی عربی تعلیم سے بھی آراستہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ مشرقی حکمت، تصوف اور فلسفہ کے ابتدائی اصول بھی اس طرح ذہن نشین کروائے کہ اس زمانے سے جستجو اور تفحّص کی عادت اقبال کی فطرت ثانیہ بن گئی۔ ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ بچے کی سیرت اور اس کی تعلیم و تربیت کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب کہ وہ ابھی بطن مادر میں اپنے وجود کے ابتدائی مراحل سے گزرتا ہے اور اسی وقت سے نہ صرف اجداد اور والدین کے اوصاف

پیچیدہ اور نامعلوم طریقوں سے اس کی ذہنی اور جبلی نشو و نما میں معاون ہوتے ہیں بلکہ والدین کی تمنائیں ان کے حوصلے اور خواب بھی کہ کسی نہ کسی حد تک اس کے ذوق و ذہن پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہی بات ہمیں اقبال کے ذہنی نشو و نما کے مطالعہ میں بھی نظر آتی ہے۔

شاعری کا سفر

یوں تو اقبال کی شعر و شاعری سے مناسبت بچپن ہی سے ظاہر تھی، کبھی کبھی خود بھی شعر موزوں کر لیا کرتے تھے مگر اس بارے میں سنجیدہ نہیں تھے، نہ کسی کو سناتے نہ محفوظ رکھتے۔ لکھتے اور پھاڑ کر پھینک دیتے۔ انٹر میڈیٹ میں تھے جب ان کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ لیکن اب شعر گوئی ان کے لیے فقط ایک مشغلہ نہ رہی تھی بلکہ روح کا تقاضا بن چکی تھی۔ اس وقت متحدہ ہندوستان میں اردو شاعری کے جتنے بھی رُوپ تھے، ان کی تراش خراش میں داغ کا قلم سب سے آگے تھا۔ اقبال نے بھی ان سے اصلاح کی درخواست کی جو قبول ہوئی مگر داغ اپنی بے مثال بصیرت سے اقبال کے کلام کی امتیازی خصوصیات بھانپ گئے کہ اس ہیرے کو تراشا نہیں جا سکتا۔ یہ کہہ کر فارغ کر دیا کہ اصلاح کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہے۔ مگر اقبال اس مختصر سی شاگردی پر بھی ہمیشہ نازاں رہے۔ کچھ یہی حال داغ کا بھی رہا۔ نومبر 1899ء کی ایک شام کو اقبال پہلی بار حکیم امین الدین کے مکان پر ایک محفلِ مشاعرہ میں شریک ہوئے اور اپنی ایک غزل پڑھنی شروع کی، جب اس شعر پر پہنچے کہ:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیئے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو اس مشاعرے کے بڑے بڑے شعرا نے بہت سراہا۔ یہاں سے اقبال کی بحیثیت شاعر شہرت کا آغاز ہوا۔ انجمن حمایتِ اسلام سے تعلق پیدا ہوا جو آخر تک قائم رہا۔ اس کے ملی اور رفاہی جلسوں میں اپنا کلام سناتے۔ اقبال کی مقبولیت اور ان کی شاعری کی وجہ اس انجمن کی توسط سے پنجاب کے مسلمانوں میں سماجی سطح پر دینی وحدت کا شعور پیدا ہونا شروع ہو گیا۔

لہذا اقبال کے ارتقائی سفر کے پہلے دور کا آغاز روایتی غزل گوئی سے ہوا مگر اس میں بھی ان کی طبیعت کی جدت طرازی انھیں عام ڈگر سے ہٹ کر کلام کہلوا دیتی تھی۔ ساتھ ہی اس دور میں ان کی فکر پر ان کے مصلح "داغ" کی فکر کا عکس جھلکتا ہے۔ جیسے:

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تامّل تو تھا ان کو آنے میں قاصد مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی"(6)

اس کے بعد اقبال کا فکری پھیلاؤ جب غزل میں نہ سمٹ پایا تو انھوں نے **نظم** کو اپنے احساسات کے بیان کا ذریعہ بنایا۔ اس دور میں اقبال کی حقیقت کا متلاشی ہوا فکر پر مغربی ادب کے اثرات انگریزی نظموں کے تراجم کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ مغربی ادب میں بھی ان کا رجحان اصلاحی مضامین کی طرف تھا۔ اسی دور میں آگے چل کر ان کی فکر پر صوفیانہ تصوف کے مدہم سے نقوش نظر آنے لگے۔ جن میں سے کچھ ان کی اپنی فکر سے ٹکرے بھی۔ لیکن آگے چل کر انہوں نے ان منفی تصورات کے اثر کی خود اصلاح کی۔ اسی دور کی نظموں میں فلسفہ خودی کے کئی عناصر خام صورت میں نظر آئے، جو بعد میں اپنی صورتیں واضح کرتے ہوئے تصور خودی میں ڈھل گئے۔ تصور خودی کی واضح تصویر اقبال کی فکر پر چھاتے ہی اقبال اس میں رنگ بھرنے کے لیے۔ اور اس سلسلے میں "پرندے کی فریاد" اور "ایک آرزو" جیسی نظمیں سامنے آئیں۔ اسی دور میں اقبال پر وطن پرستی کی چاپ لگائی جاتی ہے، جبکہ میری نظر میں یہ اصطلاح درست نہیں ہے۔ کیونکہ وطن پرستی کی بنیاد خاص علاقے، گروہ، طبقہ یا مذہب کے ساتھ محبت تک محدود ہوتی ہے، جبکہ اقبال کی فکری وسعت، انسانی ہمدردی کے جذب اور اصلاح کی خواہش پورے ہندوستان کے عوام کے لیے تھیں جہاں ہندو، سکھ، عیسائی، مسلمان اور دوسرے کئی مذاہب، رنگ و نسل کے لوگ تھے۔ جو صدیوں سے ساتھ رہ رہے تھے۔ ایسی صورت میں اقبال کی ان نظموں: "ترانہ ہندی"، "ہندوستانی بچوں کا گیت"، "نیا شولہ" اور "صدائے درد" کی بنا پر اقبال کو وطن پرست کہنا درست نہیں بلکہ بہتر اصطلاح حب الوطنی استعمال ہونی چاہیے۔ اس دور میں اقبال کی فکری ارتقاء کی سب سے بڑی خوبی یہی نظر آتی ہے کہ اقبال محض ذاتی ذوقِ طبع کی خاطر فن و ہنر میں جولانی طبع نہیں دکھاتا بلکہ ان کے پیش نظر ہمیشہ گرد و پیش اور اجتماعیت کی فلاح دیکھائی دیتی ہے۔ یہاں ان کی فکری ارتقا کا پہلا دور اختتام پذیر ہوتا ہے۔

سفر یورپ کے دوران علامہ اقبال کے فکری زاویے

1905ء سے 1908ء تک علامہ اقبال کی شاعری کا دوسرا دور ہے۔ یہ دور وقت کے لحاظ سے تو محض تین سال کا ہے لیکن یہ اقبال کی فکری پختگی کی اساس ہے۔ یورپ روانہ ہوتے وقت اقبال ایک ابھرتے ہوئے قومی شاعر کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے، اس وقت تک ان کی فکر کا محور یہ موضوعات تھے: مناظر فطرت کے مشاہدات کا تاثر، حب وطن اور ارباب وطن سے عقیدت، عقل اور عشق، تصوف اور نظریہ وحدت الوجود، اور اسرار حیات کا تجسس۔ اقبال کے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے سفر یورپ اور وہاں قیام کے دوران ان کی فکر میں جو ارتقائی تبدیلیاں واقع ہوئیں اس کا تفصیلی جائزہ پیش خدمت ہے:

اس دور کی ابتدا میں اقبال کی شاعری پر فلسفہ جمالیات کا اثر نمایاں ہے۔ یہ مختلف نظریات، متضاد جذبات اور سوچ کی کشمکش کا دور تھا جس سے اقبال گزر رہے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں بصیرت عطا کی اور اس نے یورپی معاشرے کا باریک بینی سے مطالعہ کیا اور اس کے بارے میں کچھ چیزوں کا ادراک کیا۔ علامہ محمد اقبالؒ نے دورانِ قیام یورپ کیمبرج، ہائیڈل برگ اور میونخ کی یونیورسٹیوں میں فلسفے اور قانون کی تعلیم حاصل کی۔ اس وقت یورپ کی فکر ہیگل کے فلسفے کے تلسم میں جکڑی ہوئی تھی۔ ہر طرف مادہ پرستی، عقل پرستی، اور سائنسی ترقی کی وجہ سے ملحدانہ سوچ کا راج تھا۔ جو کہ اقبالؒ کے مزاج اور افکار کے خلاف تھا۔ اقبال نے دیکھا کہ یورپ کا ریاستی نظام پوری طرح مادہ پرستی کا شکار ہے جن کی خارجہ پالیسی صرف اپنی قومی مفادات کے پیشِ نظر ہوتی ہیں جو اکثر یورپی ریاستیوں کے مابین جنگ کا باعث بنتی ہیں۔ ان دنوں اقبالؒ جمال الدین افغانی کے اسلام کے نظریۂ وحدت و استحکام کے زیرِ اثر تھے۔[7] تو جب اقبال نے یورپ کے نظریات اور ان کے نتائج دیکھے تو اپنے تصور وحدت الوجود اور علاقائی حب الوطنی دونوں کو مسترد کر دیا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ نسل، زبان اور وطن کی بنیاد پر انسانی وحدت کے حصول اور اس کے وجود کے قیام کا دارومدار دوسری قوموں کے ساتھ مسلسل جنگ و جدل پر ہی ہے۔ جو کہ نہ صرف غیر انسانی ہے بلکہ اسلام کے اخلاقی اقدار کے منافی بھی ہے ۔ یورپ پر لمبے عرصے تک اسلامی اقتدار رہنے کے سبب یورپی دنیا اسلامی نظریات سے بخوبی آگاہ تھی۔ اسلامی اقتدار کے دور میں جہاں یورپ کی علم و تہذیب سے شناسائی ہوئی وہاں تاریک ذہنیت رکھنے والے مادہ پرستوں کو اسلامی مساوات اور اخوت کے اصول چھبنے بھی لگے اور اسی وجہ سے انھوں نے اپنی سامراجی حکمتِ عملی کے ذریعے امتِ مسلمہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے پہلی جنگ عظیم کے بعد، عالمِ اسلام میں قوم پرستی کا مغربی نظریہ پھیلا کر اسلامی خلافت کو ختم کر کے الگ الگ خود مختار ممالک میں بٹا کر حاصل کر لیا تھا۔ اقبال کی حساس اور مغربی تہذیب کے بغور مشاہدہ نے ان کی توجہ قومی اور اسلامی مسائل پر مرکوز کر دی۔ اسی دوران اقبال نے شعر گوئی ترک کرنے کا ارادہ کیا کیونکہ اقبال نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایسی شاعری کرے جو نوجوانوں کو عمل سے عاری کر دے۔ اس پر سر ارنلڈ اور سر عبد القادر نے انہیں آمادہ کیا کہ وہ اپنی بلند پایہ شاعری سے قوم کی ایسی تعمیری خدمت انجام دے سکتے ہے جو کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں یوں اقبال کو اپنی رائے بدلنی پڑی اور اس کی بدولت ہندوستان کو ایک عظیم شاعر نصیب ہوا۔ انھوں نے ایک نظم سر عبد لقادر کے نام خط میں لکھی جس سے علامہ کا نیا شعری منشور چھلکتا ہے۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں"[8]

اس دور میں اقبال اسلامی نقطہ نظر سے اصلاح وطنیت کے حوالے سے خاصہ غور و فکر کر رہے تھے۔ اور اپنے ہم وطنوں کو نظریہ زندگی درست کر لینے پر زور دیتے رہے۔ گویا اب اقبال شاعر سے بڑھ کے پیامبر بن گئے۔ اس کا نمونہ طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام لکھی نظم ہے:

"اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے عشق کے درد مند کا طرز کلام اور ہے۔
طائر زیر دام کے نالے تو سن چکے ہو تم یہ بھی سنو کہ نالہ طائر بام اور ہے۔"(9)

اسی دور میں اقبال کو اس بات کا قوی احساس ہو گیا تھا کہ میری مخاطب اصل میں ملتِ اسلامیہ ہے نہ کہ ہندوستان کی تمام قومیں۔ اس دور میں بہت سی ایسی نظمیں نظر آتی ہیں جن میں خاص طور پر مسلمانوں کے حالات کو پیش کیا گیا ہے اور یہ پیغام دیا ہے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ صرف اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ جیسے نظم صقلیہ وغیرہ میں:

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا حسن عالم سوز جس کا آتش نظارہ تھا"(10)

دوسری نمایاں تبدیلی جو انہی دنوں اقبال کی طبیعت میں واقع ہوئی وہ یہ تھی کہ ایرانی نظریہ پر تحقیقی کاموں کے سلسلہ میں جب انہیں علوم فلسفہ اور اخلاق کی بہت سی فارسی کتابیں پڑھنے کا موقعہ ملا تو انہیں یہ احساس بھی ہوا کہ فارسی زبان میں اردو کی بہ نسبت اظہار خیال کی وسیع گنجائش ہے اور اسی خیال نے انہیں فارسی میں شعر کہنے کی طرف راغب کیا۔

اقبال یورپ کی ترقی کو سراہتے ضرور ہیں لیکن ان کی اس ترقی کے حصول کا طریقہ اور اس کے انسانیت پر منفی اثرات جس کی وجہ جدید یورپی نظریے کے زیر اثر مادہ پرستی ہے۔ اس طرز کی تہذیبی ترقی سے بیزار نظر آتے ہیں۔ اور واضح الفاظ میں اس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دیار مغرب کے رہنے والوں! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہو گا

مہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا(11)

اس دور میں اقبال نے 24 نظمیں اور 7 غزلیں تحریر کیں۔ جو بانگ درہ کے حصہ دوم میں شامل ہیں۔ یہ دور اقبال کے افکار و خیالات کے متعین شکل میں ڈھلنے کا دور ہے۔ جو جولائی 1908ء کو اقبال کے انگلستان سے اپنے وطن کے لئے روانہ ہونے پر مکمل ہو جاتا ہے۔۔

سفر یورپ سے واپسی پر علامہ اقبال کے فکری زاویے

اس دور میں محمد اقبال قومی شاعر سے "سر علامہ محمد اقبال، شاعر مشرق" بنے۔ اپنے بلند پایہ فلسفہ سے دنیا کو انسان کے بنائے ہوئے تہذیبی اصولوں اور اللہ کے اپنے پیغمبر آخر زماں کے ذریعے دیے ہوئے اصولوں کا فرق سمجھایا۔ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور اپنا تشخص بحال کرنے کے لیے رہبر بن کر انھیں ابھارا۔ گو کہ اقبال اٹھائیس برس کی جواں عمری میں یورپ گئے اور وہاں کے مذہب سے ناآشنا آزادانہ ماحول میں تین سالہ قیام پذیر رہے لیکن اعلیٰ اخلاقی تربیت، دین سے لگاؤ اور روحانیت سے وابستگی کے سبب اقبال کی اس قدر قلبی ماہیت ہوئی کہ اقبالؒ مفکر اسلام اور شاعر مشرق بن کر واپس لوٹے۔ اپنی اس کیفیت کو اقبال یوں بیان فرماتے ہیں۔:

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی　　افق سے آفتاب ابھرا گیا دور گراں خوابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے　　تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی"(12)

یہ دور اقبالؒ کے لیے غور و فکر کی گہرائیوں میں اترنے کا سفر ہے جہاں آگے چل کر اقبال نے قرآن کے ذریعے معرفتوں کے سمندر میں غوطہ لگا کر خالق کائنات کی معرفت کے ساتھ سے گہرے روابط قائم کیے۔ اوراب ان کے نزدیک مسلمان کا قوم امت مسلمہ اور اس کا وطن پوری سرزمین ہے۔ اقبال کا نظریہ وطنیت اور قومیت مکمل تبدیل ہو گیا۔ یہ ان کی قلبی کیفیت کی تبدیلی ہی تھی کہ جو پہلے اقبال حب الوطنی میں اس حد تک گئے کہ لوگ انھیں وطن پرست کہنے لگے اور اب آگے چل کر وہ فرماتے ہیں۔:

"ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے　　جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے　　اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے " (13)

یہ فکری تبدیلی صرف ان کی شاعری تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ ان کی زندگی کے ہر پہلو پر چھانے لگی۔ اقبال اللہ کی تخلیق اشرف المخلوقات "انسان" کو قرآن کی روشنی میں اس کا مقام، اسکو عطا کردہ صلاحیتوں کا اسے ادراک کرانے اور اسے اپنا مقصد حیات پہچاننے کی کوشش میں ایک رہبر و رہنما بن کر لگ گئے۔ جن کا ثبوت اس شعر سے عیاں ہے:

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے　　جہاں ہے ترے لیے تو نہیں جہاں کے لیے" (14)

اقبال نے صرف رہنما بن کر حضرت انسان کو اس کی ذات کی معرفت ہی نہیں کرائی بلکہ حکیم الامت بن کر اس بھولے بھٹکے کے کردار و اخلاق پر چھائے تہذیبی وباء کے اثرات کی دوا بھی کی:

"تو برگِ گیا ہے ندہی اہلِ خرد را　　او کشتِ گُل و لالہ بہ بخشد بجزے چند
حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گُلگوں　　مسجد میں دھرا کیا ہے بجز مَوعظہ و پند

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر تاویل سے قُرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند
فردوس جو تیرا ہے، کسی نے نہیں دیکھا افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند (15)

قیام یورپ کے دوران اقبال نے بڑے قریب سے مشاہدہ کیا کہ اہل یورپ اور خصوصاً برطانیہ، ایشیا پر قبضہ جمانے کر مسلم ممالک کے وجود کو ناپید کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یورپ نے مسلمانوں کا اتحاد توڑنے کی حکمت عملی اپنا کر مسلم ممالک کو آپس میں الجھا دیا جس کے نتیجہ میں ترکی کی سلطنت جس کی سرحدیں ایشیا سے لے کر یورپ تک پھیلی ہوئی تھیں فوجی اعتبار سے اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ انگریزوں کے حملے کے نتیجہ میں اپنا دفاع تک نہیں کر سکی۔ افغانستان تقلید، جہالت اور رسوم پرستی کی لعنت میں یورپ کے جال میں جکڑ گیا تھا۔ ایران روس اور برطانیہ کی ملوکیت کے زیر اثر لایا جا رہا تھا تو دوسری طرف مصر اور سوڈان باقاعدہ انگریز تسلط میں آ گئے تھے۔ الجیریا اور تیونس پر فرانس نے قبضہ کیا اور الجزائر کے مسلم ممالک ڈرچ کی نو آبادیاں بن گئیں۔ اس صورت حال نے اقبال کے ہمدرد اور پر خلوص دل میں امت مسلمہ کا درد جگایا۔ اور انھیں امت مسلمہ کے اتحاد کی اشد ضرورت محسوس ہوئی۔ انہی عوامل نے فکر اقبال میں ایک نمایاں ارتقائی تبدیلی پیدا کی جس کے نتیجے میں انہوں نے وطنیت کے تنگ نظر اور محدود یورپی تصور سے متنفر ہو کر اخوت انسانی کے اصول پر مبنی ایک بین الاقوامی معاشرہ کے قیام کے تصور کو اپنی شاعری اور فکر کا بنیادی موضوع بنا ڈالا۔

جبکہ فکر اقبال پر تنقید کرنے والوں نے اقبال کے اس فکری ارتقاء کی غلط تعبیر پیش کی کہ اقبال یورپ سے واپسی کے بعد وطنیت کے خلاف ہو گئے تھے۔ جب کہ اقبال وطن پرستی کے اس یورپی سیاسی اور انتہا پسندانہ تصور کے خلاف تھے نہ کہ وطنیت کے خلاف۔ اقبال کے مطابق یورپ کا یہ سیاسی تصور وطنیت انسانیت کی موت ہے لیکن اگر جذبہ وطنیت کو سیاسی تصور سے پاک رکھا جائے تو تصور وطن اسلام کے تصور قومیت سے متصادم نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان کے یہ اشعار ان کے اسی فکری رجحان کی ترجمانی کرتے ہیں:

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے قومیّتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے "(16)

قومیت سے اقبال کی مراد وہ تصور انسانیت ہے جس کا عملی درس نبی کریمؐ اور آپ کے خلفاء راشدین نے تین براعظموں پر محیط خلافت کی صورت میں دیا۔ جو اخوت، احترام انسانی، اور ہمدردی جیسے اصول پر مبنی ایک بین الاقوامی معاشرہ کا قیام ہے۔ برطانیہ اور یورپ کے اسلام دشمنی کے حالات دیکھتے ہوئے جب اقبال ہندوستان واپس آئے تو

متحدہ ہندوستان (جہاں ہندوؤں کو ہمیشہ مسلمانوں پر ترجیح دی جائے گی اور ان کے ساتھ ناانصافی کی جائے گی۔) کے بجائے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا خواب دیکھنا شروع کیا اور یوں انہوں نے پاکستان کا نظریہ پیش کیا۔ اپنی شاعری سے مایوس ہندوستانی مسلمانوں کے ایمان کو زندہ کیا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ قائداعظم کو انگلستان سے ہندوستان واپس آنے اور مسلم سیاست کی قیادت کرنے پر آمادہ کیا۔ اقبال کا تصور آزادی صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے الگ مملکت بنانے تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ ان کا یہ تصور تمام مقبوضہ مسلم ممالک کی آزادی کے تصور کا آئینہ دار ہے چونکہ ہندوستان کی غلامی کی حالات اقبال کی نظروں کے سامنے تھے اس لئے اقبال جیسے حساس انسان کے لیے فطری طور پر ایسے حالات ناقابل قبول تھے ۔ اقبال مسلمانوں کا غلامی پر خاموش رہنے پر دل گرفتہ تھے۔ کہ مسلمان غیرت ایمانی دیکھا کر ان غلامی کی ان زنجیروں کو توڑ کیوں نہیں دیتے۔ فرمایا:

"معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقان ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیر زمین ہے
جاں بھی گرو غیر، بدن بھی گرو غیر افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو مجھ کو تو گلہ مجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے"(17)

اس دور میں اب اقبال نے مسلمانوں کو آزادی کے حصول کے لیے بیدار کرنے کو اپنا مقصد بنالیا۔ اور اپنے کلام سے مسلمانوں میں جذبہ آزادی پیدا کرتے رہے۔ جیسے:

آزاد کی رگ سخت ہے مانند رگ سنگ محکوم کی رگ نرم ہے مانند رگ تاک
حکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید آزاد کا دل زندہ و پر سوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دل روشن نفس گرم محکوم کا سرمایہ فقط دیدہ نم ناک"(18)

اقبال نے اپنے نظریہ ملت سے مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس وقت ایک قوم کی حیثیت سے ان کی پہچان ہندوستانی ہے۔ اور اس پہچان کو اپنانے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مذہب کو علیحدہ چھوڑ کر ہندوستان کی باقی اقوام کی قومیت یا ہندوستانیت میں جذب ہو جاؤ۔ کیونکہ جدید نظریہ تہذیب کے مطابق مذہب اور سیاست جدا جدا چیزیں ہیں۔ لہٰذا مشترکہ ہندوستان میں رہنا ہے تو مذہب کو محض انفرادی زندگی تک ہی محدود رکھنا ہو گا۔ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو علیحدہ قوم تصور نہیں کیا جائے گا۔ اقبال کی فکر کا بنیادی موضوع چونکہ اسلام ہے۔ لہٰذا اقبال مذہب ہی کو انسانی زندگی کے مکمل اظہار کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ اسلام دین ہے یعنی انسان کی پوری زندگی ؛ انفرادی، اجتماعی، معاشی، معاشرتی، سماجی، اور سیاسی غرض ہر پہلو کے لیے واضح لحہ عمل دیتا ہے۔ اور ایک الگ اور نمایاں

تہذیب دیتا ہے۔ اسلامی تہذیب دنیا کی باقی تہذیبوں سے مختلف ہے۔ بقیہ تہذیبوں خصوصاً مغربی تہذیب کی بنیاد مادہ پرستی پر ہے جبکہ اسلامی تہذیب کے بنیادی اصول و نظریات میں عدل و انصاف، اتحاد و اتفاق، محبت و یگانگت، تصور توحید، مساوات، رواداری، اور علم جیسی خصوصیات ہیں۔ اس تہذیب میں فکر و عمل لازم و ملزوم ہیں۔ مسلم تہذیب کا دوسری تہذیبوں سے تقابل کرتے ہوئے علامہ ان کے درمیان بنیادی فرق کو یوں بیان کرتے ہیں:

"اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں اور جمعیت ہوئی رُخصت تو ملت بھی گئی "(19)

اقبال کے نزدیک نظریہ توحید اسلامی تہذیب کی بنیاد ہے۔ اس سے وابستہ افراد کی ایک ایسی جماعت بن جاتی ہے جو رنگ نسل، زبان یا وطن کے لحاظ سے مشترک ہونے کے باعث وجود میں نہیں آتی بلکہ مشترکہ روحانی نظریہ سے بنتی ہے۔ یعنی اسلامی قومیت کا اصل اصول ایک خاص تہذیبی تصویر جس میں زماں و مکاں سے ماورا بڑھتے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعا موجود ہے پر مبنی برادری سے تعلق ہونا ہے میں جو جناب رسالت مآب نے قائم فرمائی تھی۔ اور جس کے لیے تمام کرہ ارض مسجد قرار پائی۔ اسلامی تہذیب کی بنیاد توحید کے محکم، مضبوط اور غیر تغیر پذیر اصول پر ہے۔ جس سے اس مسلسل تغیر پذیر دنیا میں قدم جمے رہتے ہیں اور اکھڑنے نہیں پاتے۔ جسے اقبالان الفاظ میں پیش کیا:

زندہ قُوّت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی آج کیا ہے، فقط اک مسئلۂ عِلم کلام
روشن اس ضَو سے اگر ظُلمتِ کردار نہ ہو خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
مَیں نے اے میرِ سپہ! تیری سپہ دیکھی ہے قُلْ ھُوَ اللہ، کی شمشیر سے خالی ہیں نیام
آہ! اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا، نہ فقیہ وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام!"(20)

اس میں کوئی دو آرا نہیں کہ اس کی تہذیبی بقا و ارتقاء نبی ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہی اور ان سے محبت اور ختم نبوت کے عقیدے پر جمے رہنے میں ہے۔ اقبال نے فرمایا:

در دل مسلم مقام مصطفی است آبروئے ما از نام مصطفی است "(21)

علامہ کے نزدیک ختم نبوت ایک امتیازی، الگ اور تا ابد رہنے والی تہذیب کا نقطہ اساس ہی نہیں بلکہ قوت و شوکت کا پیغام بھی ہے:

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگ حشیش جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام "(22)

عقیدہ ختم نبوت سے ہی اسلامی تہذیب میں عقل اور شعور کو مافوق الفطرت خیالات سے آزادی ملی ہے۔ توحید کی طرح ختم نبوت بھی ملت اسلامیہ کو ایک روحانی بنیاد فراہم کرتی ہے جس کی وجہ سے ایک مسلمان زبان، نسل، اور زمان و مکان کے بندھنوں سے آزاد ہو کر اسلامی تہذیب کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس کے لیے اقبال اپنی زندگی کو نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

کافر ہندی ہوں مَیں، دیکھ میرا ذوق و شوق دل میں صلوٰۃ و دُرود، لب پہ صلوٰۃ و دُرود

شوق مری لَے میں ہے، شوق مری نَے میں ہے نغمۂ 'اللہ ھو' میرے رَگ و پَے میں ہے "(23)

چونکہ اقبال کا تعلق کشمیری برہمنوں کی نسل سے ہے۔ لیکن اسلام میں داخل ہونے کے بعد آپ کا خاندان اسلامی تعلیمات اور عشق رسول کا علم بردار بن گیا۔ نہ تو ان کو اسلامی تہذیب کا حصہ بننے میں کوئی چیز مانع ہوئی نہ دنیاوی ترقی میں اسلام ان کے لیے کوئی روکاٹ بنا۔ بلکہ جب مغربی فلسفہ اور نظریہ ان کے اسلامی عقائد سے متصادم ہوئے تو ان بیمار یورپی نظریات کی وبا سے بچنے کے لیے نبی ﷺ کی تعلیمات سے رہنمائی حاصل ہونے کی التجاء ان اشعار میں کی:

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر میری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زُنّاری "(24)

یورپ میں اعلیٰ تعلیم کے دوران ابتدا میں فرنگی اساتذہ کا دلکش طریقہ تدریس، مختلف النوع نظریات کا تعارف اور ان کے خلاف براہین اور دلائل اقبالؒ کو بہت اچھے لگا لیکن جب ان پر یورپ کے نظریات کا راز کھلا تو انھیں اسلامی تعلیمات ان یورپی تعلیمات سے بہت بہتر لگی کیونکہ اسلامی تعلیمات دلائل کی بجائے چیزوں کی حقیقت واضح کر دیتے ہیں۔ اسلامی تہذیب کی روحانیت اور مغربی تہذیب کی ظاہری چکاچوندی کا تقابل کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:

مجھے وہ درس فرنگ آج یاد آتے ہیں کہاں حضور کی لذت کہاں حجاب دلیل "(25)

اقبالؒ عاشق قرآن اور عاشق رسول ﷺ بھی تھے۔ آپ نے اسلام کے ان دو بنیادی مآخذ قرآن کریم اور احادیث نبوی ﷺ سے جو کچھ سیکھا اس کی ترویج و اشاعت اپنی اردو اور فارسی شاعر کے ذریعے کی جیسے:

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاسُ الکِرام "(26)

یوں اقبال اپنے کلام کے ذریعے سوز حیات اور روح انسانی کا نغمہ عشق و مستی سناتے سناتے 21 اپریل 1938ء کو 61 سال کی عمر میں پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے تقریباً 9 سال قبل عشق حقیقی کی زد راہ لیے خالق حقیقی کی طرف لوٹ گئے۔ علامہ اقبال اپنی کہانی حیات کے ہر کردار میں بام عروج پر نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کے درجات کو جنت الفردوس میں بلند فرمائے۔ آمین

یہاں تک علامہ اقبال کے سفر یورپ پر جانے سے قبل اور بعد کے تین ادوار پر مشتمل اسلامی افکار کے زاویوں کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی ایک چھوٹی سی کوشش تھی۔ اب اس مقالے کے تحقیقی منہج کے باب سوم میں اقبال کے افکار اور عصر حاضر کے ساتھ ان کی موافقت اور ضرورت کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی ان شاءاللہ۔

علامہ اقبال کے افکار اور عصر حاضر

اقبال کی سوانح حیات کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہے کہ اقبال کی فکر کا مرکز و محور قرآنی تعلیمات ہی تھی۔ اقبال کی گہری بصیرت نے حکمت قرآن و صاحب قرآن ﷺ کی روشنی میں اسلام دشمنوں کی چالوں کو سمجھ لیا تھا۔ کہ جیسے ان یورپیوں نے اسلامی خلافت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں بھانٹ لیے اب یہی سازشی ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے ہندو مریدوں کی وفاداری کے انعام کے طور پر ان کے حوالے کرنے والے ہیں۔ جس کا مطلب مسلمانوں کے اجتماعی تشخص کو فنا کرنا تھا۔ جو کہ یورپ کی جدید تہذیبی پالیسی کا حصہ ہے۔ کیونکہ الہامی اور غیر الہامی مذاہب میں صرف اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو ایک مکمل دین یعنی ضابطہ حیات ہے۔ جس میں انسان کی زندگی کا ہر پہلو دین سے جوڑا ہوا ہے۔ اسلام میں مسلمان کی زندگی دین کے بغیر زندگی ہی تصور نہیں ہوتی۔ اسے اقبال نے یوں بیان کیا:

اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زِندوں میں ہے سرِّ آدم ہے، ضمیر کُن فکاں ہے زندگی۔"(27)

اور اس کی وجہ بھی اب کوئی راز نہیں رہا۔ مغرب نے اپنے الہامی نظریات کو اس قدر مسخ کر دیا ہے کہ اب ان کے مذہبی نظریات ان کی زندگی کے ساتھ قدم ملا کے نہیں چل سکتے۔ یا تو انھیں مذہبی نظریات کا لباس اوڑ کر زندگی کو کلیسا اور صلیب تک ہی مقید رکھنا ہو گا یا پھر نئے طرز زندگی کے حصول کے لیے ہر جائز ناجائز حربے اپنانے ہوں گے۔ جن کی راہ میں کچھ بچی کچی الہامی نظریات رکاوٹ ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ مذہب کو اجتماعی زندگی سے الگ کر دیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ ذاتی زندگی میں بھی مذہب کو شامل کرنے نہ کرنے کا اختیار حاصل

ہو گیا۔ کیونکہ پھر آگے بڑھنے کی دور میں مذہب کے لیے وقت ہی نہیں بچا۔ لیکن اسلام چونکہ آخری الہامی مذہب ہے اور اللہ کی طرف سے قیامت تک کے تمام انسانوں کے لے ہدایت نامہ ہے۔ لہٰذا اسلام اب بھی اور قیامت تک ہر انسان اور ہر طرح کے حالات کے ساتھ موافقت اور مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن مغرب اسلام کو نہ مانتے ہوئے بھی اس کے وجود سے خائف ہیں۔ کیونکہ وہ خود غرضی اور انسانیت سوز قوانین پر مبنی اپنی مادی ترقی کی راہ میں کوئی روکاوٹ نہیں دیکھنا چاہتے۔ انھیں شاید یہ بھی ڈر رہا کہ کہی ان ہی کی نسل میں سے کوئی اسلام کی اخوت و مساوات کے قوانین کو دیکھ کر متاثر ہو کر ان کے نظریات پر سوال نہ اٹھائے۔ اس لیے ہر دور میں مغرب کی اسلام مخالف حرکات و سکنات جاری رہتی ہیں بس انداز بدلتے رہتے ہیں۔ اقبال جیسے مفکرین اور قائد اعظم جیسے رہنماؤں کی کاوشوں سے ہندوستان کے مسلمان آزاد ملک تو حاصل کر گئے لیکن افسوس آج تک خود مختاری حاصل نہ کر سکے۔ اور اس کی بنیادی وجہ کے ہم ذہنی طور پر آج بھی مغربی تہذیب کے غلام ہیں۔ اس لیے کہ ہمیں ان کی تہذیب اور ترقی بہتر نظر آراہی ہے۔ اور اس غلامی میں ہم اپنی اسلامی تشخص اور اپنے اقدار و روایات کو بھولا کر ان کی اندھی تقلید میں لگے ہیں۔ اس کیفیت کو اقبال نے اپنے کلام کے ذریعے یوں بیان کیا ہے:

"زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک نوجواں اقوامِ نَو دولت کے ہیں پیرایہ پوش"(28)

آج کے ہمارے ملک کے اندرونی حالات کی بہترین تصویر کشی اقبال نے اس ملک کے وجود میں آنے سے پہلے ہی کر دی۔ کہتے ہیں:

آ بتاؤں تُجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الْمُلُوْک سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادُو گری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سُلا دیتی ہے اُس کو حُکمراں کی ساحری۔(29)
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے۔(30)
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس، الاماں! یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گُلستاں سمجھا ہے تُو آہ اے ناداں! قفَس کو آشیاں سمجھا ہے تُو۔(31)

اور آج جو امت کے خون سے انسان سوزی کی تاریخ لکھی جارہی ہے۔ جہاں بارود کی تپش میں امت کے جگر کی بوٹیاں بھونی جارہی ہیں لیکن امت مغرب کے نرغے میں اپنی گردنیں ایسے پھنسائے بیٹھے ہیں کہ درد کے

مارے آنکھ بھی نم نہیں ہونے دیتے کہ کہی آقاؤں کو ناگوار نہ گزرے۔ اقبال امت کی خستہ حالی کو یوں اپنے درد بھرے الفاظ کا لباس پہناتے ہیں:

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہُو مُضطرب ہے تُو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز۔"(32)

یہ جو پیش کیا گیا یہ تو حالات حاضرہ کا آئینہ ہے۔ ابھی تو اس امت نے اسلام دشمنی میں اور پسنا ہے۔ اقبال امت سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:-

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں آنے والے دَور کی دھُندلی سی اک تصویر دیکھ

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردُوں کے پاس سامنے تقدیر کے رُسوائیِ تدبیر دیکھ۔(33)

اقبال نے اپنے کلام میں جہاں امت کو جابجا آئینہ دیکھایا ہے وہاں انھیں حوصلہ بھی دیا ہے کہ جب تک سانسیں باقی ہیں اپنی اصلاح کرو۔ کیونکہ مسلمان جب حق کے لیے اٹھتا ہے تو اللہ اس کی کوتاہیوں سے درگزر کر کے اس کی مدد فرماتا ہے۔ زندگی تحریک سے ہے سکوت سے نہیں پھر چاہے یہ تحریک انفرادی ہو یا اجتماعی۔ لہٰذا آج امت جو مغربی تہذیب کی روشنیوں میں گم اسلامی تعلیمات سے دور ہوتی جارہی ہے کو اشد ضرورت ہے کہ وہ نبی ﷺ کی تعلیمات پر محبت کے ساتھ عمل پیرا ہوں۔ کیونکہ اللہ کی محبت کا دروازہ عشق رسول کے راستے چل کر ہی کھلتا ہے۔ اقبال آج کے مسلمان کو ان الفاظ میں اپنا پیغام دے رہے ہیں:

"قلزمِ ہستی سے تُو اُبھرا ہے مانندِ حباب اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹّی کا اک انبار تُو پُختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تُو۔"(34)

"مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام"(35)

غرض فکرِ اقبال کا مطالعہ قرآن و سنت کے حقیقی پیغام تک رسائی حاصل کرنے کا موثر ذریعہ ہے۔ پیغامِ اقبال کا مقصد یہ ہے کہ قرآن و سنت سے مسلمان عملی طور پر کسی بھی صورت دور نہ ہونے پائے کیونکہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے تعلیماتِ قرآن کے بغیر زندگی نامکمل ہے۔ جیسا کہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

"گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن۔"(36)

کلامِ اقبالؒ میں بے شمار قرآنی آیات، تلمیحات(37)، تمثیلات(38) اور تشبیہات(39) و استعارات(40) موجود ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر کرتے ہیں:

"میرے اللہ ہر برائی سے بچانا مجھ کو نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو"(41)

شعر کا پہلا مصرعہ "سورۃ العمران، آیت:193"، "وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا" جبکہ دوسرا مصرعہ "سورۃ الفاتحہ، آیت :7" "صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کی بہترین ترجمانی ہے۔

"ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن"(42)

اس شعر میں "سورۃ الفتح، آیت:29" کی طرف اشارہ ہے :

"وَ الَّذِيْنَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ"

"ہے انفس و آفاق میں پیدا تیرے آیات حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تیری ذات۔"(43)

یہ شعر تمثیل ہے "سورۃ فصلت، آیت:53" کی

"سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَ فِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ"

علامہ اقبالؒ مقصد قرآن بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"The main purpose of the Quran is to awaken in man the higher consciousness of his manifold relations with God and the universe." (44)

"قرآن حکیم کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ خدا اور کائنات سے انسان کے مختلف الجہات روابط کا بلند تر شعور اجاگر کرے۔"

اقبال کی قرآن پاک سے وابستگی:

"دوران تلاوت اقبال کے آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا۔ تلاوت بہت رغبت اور ذوق و شوق سے کرتے تھے۔ ڈاکٹر اقبال کی وصیت کے مطابق جب ان کی کتابیں اسلامیہ کالج لائبریری کو دی گئیں تو ان میں قرآن پاک کا وہ نسخہ بھی تھا جو آنسوؤں سے تر تھا۔"(45)

الغرض! علامہ اقبالؒ کی شاعری اور نثری کلام قرآن کریم و سنتِ رسول ﷺ کا حقیقی پیغام لیے ہر دور میں انسانیت کی رہنمائی کرتی ہے۔ ان تعلیمات کی روشنی میں ہماری نئی نسل قرآن و حدیث کو وسیع انداز میں سمجھ کر اپنی روشن مستقبل کی بنیاد رکھ سکتے ہیں

خلاصہ بحث

علامہ اقبالؒ کی زندگی کا سفر 1877 سے 1938 تک 61 سال کے عرصہ پر محیط محمد اقبال سے علامہ محمد اقبال شاعر مشرق، بانی نظریہ پاکستان، مفکر اسلام، اور داعی اسلام بنے۔ اس عرصہ میں وقت کے ساتھ ساتھ ان کے فکری رجحانات میں نکھار اور پختگی نظر آتی ہے۔ جن کے پیچھے ان کے والدین کی تربیت، باشعور اساتذہ سے تعلیم کا

حصول، علما و ادبا کی صحبت، دین اسلام سے محبت، ہمدردانہ اور پر خلوص مزاج، شرق و غرب کے نظریات کا مطالعہ اور گزشتہ اور موجودہ حالات پر گہری نظر و غور و فکر کی عادت کا فرما ہیں۔ ابتدائی دور میں ان کے کلام میں ان کا فکری رجحان رومانیت، فطرت، داحدۃ الوجود اور محب الوطن وطنیت کی صورت میں نظر آتا ہے۔ دوسرے دور یعنی قیام یورپ کے دوران جہاں نئے نظریات اور فلسفوں سے ان کو تعارف حاصل ہوا وہاں مغربی سیاسی افکار اور اس کا شکار ہوئی اسلامی تہذیب، کی زوال پذیری کے اثار کا بغور مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ اس مشاہدہ سے اقبال کو مغرب کا مشرقی اور خاص طور سے اسلامی ممالک کو زیر کرنے کے حربوں کا علم ہوا جن میں خطرناک ترین "وطنیت اور قومیت" کا مغربی نظریہ تھا۔ اس نظریے کا طریقہ کار مسلمانوں کو آپس میں تعصب میں مبتلا کر کے ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا تھا۔ یہ قبیح حقیقت جان لینے کے بعد اقبال نے مغربی تہذیب کے نمایاں پہلوؤں جیسے: ثقافتی، تمدنی، اقتصادی، سیاسی، معاشرتی، مذہبی، اور اخلاقی کا باریکی سے مطالعہ کیا۔ مغرب کی اسلام دشمنی کی وجوہات کی کوج میں اقبال کو مغربی نظریات کا ہر اصول اسلامی اصولوں سے متصادم نظر آیا۔ کیونکہ مغربی اصولوں کی اساس مادہ پرستی پر ہے یعنی: میں، میری نسل، میرا وطن وغیرہ، جبکہ اسلامی اصول اخوت، مساوات اور بھائی چارہ پر مبنی ہیں جس کے نتیجہ میں اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس اور انسانیت کے لیے ہمدردی اور احترام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لہذا اقبال نے جان لیا کہ مغربی تہذیب کسی بھی طور مثالی تہذیب قرار نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ اقبال نے نسلی امتیاز، زبان کے اشتراک اور جغرافیائی حدود کی مقید نظریہ وطنیت کو ترک کر کے نظریہ قومیت کو اختیار کیا۔ جس کی بنیادہ عقیدے، نظریے اور مذہب پر ہوتی ہے جو کہ صرف اسلام میں موجود ہے۔ اسلامی تہذیب کے بنیادی اصول محض فلسفیانہ تصورات پر مبنی نہیں۔ بلکہ ان اصولوں کی عملی شکل پیغمبر اسلام کی زندگی اور آپ کے بعد کے تیس چالیس برس کے عرصے میں پائی جاتی ہے۔ ان اصول میں پہلا توحید اور دوسرا ختم نبوت ہے۔ ختم نبوت کی بدولت بنی نوع انسان کو تہذیبی ارتقا کا وہ نقطہ کمال میسر آیا جس کے بعد تہذیبی ارتقا کے لیے کسی بھی بہتر یا برتر معیار کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ختم نبوت نے ملت اسلامیہ کو خاتم اقوام کا منصب عطا کر دیا ہے۔ اقبال ایک سچے اور پکے مسلمان تھے۔ مضبوط دینی عقائد، جدید تعلیم سے حاصل شدہ ذہنی وسعت اور اقوام عالم خاص طور سے اسلامی تہذیب کے عروج و زوال کے مشاہدے اور مطالعے نے اقبال کو عاشق قرآن اور عاشق رسول ﷺ بنا دیا۔ اقبال کی نفرت یورپ کے سیاسی ہتھکنڈوں سے تھی نہ کہ یورپ کی ہر چیز سے۔ ایک حقیقت پسند مفکر اور مبصر کی حیثیت سے انہوں نے جہاں یورپ کی بہت ساری سیاسی اور تہذیبی خرابیوں کو بے نقاب کیا وہاں اپنی تصنیف Re construction of religious thoughts in Islam میں یورپ کی خوبیوں کا بھی دل سے اعتراف کیا۔ ایک خوشائند پہلو جس کا ذکر کیا وہ یہ ہے

کہ دنیائے اسلام بڑی تیزی سے مغرب کی طرف گامزن ہے۔ اقبال کی نظر میں مغربی ممالک جانے میں کوئی خرابی نہیں ہے، لیکن (دینی اور تہذیبی اقدار کی کمزور جڑ رکھنے والوں کے لیے) اندیشہ ہے کہ یورپی تہذیب کی ظاہری چمک دمک ان کی نظروں کو خیرہ کر کے انھیں جہالت کی کھائی میں گرا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے قیام یورپ کا دور اقبال کی ذہنی تشکیل میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔

تیسرے دور یعنی یورپ سے واپسی کے بعد پر اقبال کے افکار پر دین اسلام کا غلبہ واضح نظر آتا ہے۔ پھر شاعری ہو یا نثری کلام سب کی اساس اسلام پر رکھی گئی ہے۔ تاریخ عالم اور اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اقبال نے صرف مذہب اسلام کو ہی تمام انسانیت کے لیے نجات دہندہ پایا۔ اس دور سے اقبال نے اپنے روشن افکار اور نظریات کا ماخذ قرآنِ پاک اور حدیثِ نبوی ﷺ کو "توشہ آخرت" اور "زاد راہ" جان کر بنایا۔ ان کی اسلامی اصولوں کے زیر اثر "فکر خودی" انسان کی کردار سازی کر کے اسے انسان کامل بناتی ہے۔ اقبال کے نظریات اور ان کا فکر و فلسفہ ہمیشہ سے انسانیت کے لیے رہنمائی کا باعث رہا ہے۔ اس کی نمایاں مثال پاکستان کا قیام ہے۔ اقبال کا نمایاں وصف یہ ہے کہ انھوں نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا تو سب سے پہلے اپنی ذات سے شروعات کی پھر اپنی شاعری کے ذریعہ اس صحت مند طرز فکر اور تصور انسانیت کو عام کرنے کی بھی بڑی کامیاب کوشش کی۔

سفارشات

- اسلامی تشخص کی بقا کے لیے اسلامی تہذیب کا رکن اول توحید مد نظر ہونا چاہیے۔ نہ کہ رنگ نسل، زبان یا علاقائی اشتراک۔
- ختم نبوت جو کہ ہمارے بنیادی عقائد میں سے ہے اس کا تحفظ انفرادی اور اجتماعی سطح پر کیا جائے کیونکہ یہ صرف ایک مذہبی یا دینی تصور ہی نہیں بلکہ یہ تہذیبی ارتقا کا نقطہ کمال ہے۔
- اقبال کے نزدیک غلامی کی ذمہ داری صرف ظالم پر نہیں مظلوم پر بھی اتنی ہی عائد ہوتی ہے۔ لہذا مسلمانوں کو عملی طور پر اسلامی تعلیمات کے قریب تر ہو کر خود کو ذہنی، جسمانی، فکری، سماجی اور معاشی ہر طرح کی غلامی سے آزاد رکھنا چاہیے۔
- بچوں کو مادیت پسندی سے بچانا چاہیے۔ اور انھیں مادیت پسندی کے منفی اثرات ذہن نشین کرانے چاہیے۔ کہ جن کی وجہ دنیا کی ابھرنے اور فروغ پذیر ہونے والی تہذیب کس انجام سے دوچار ہو گی۔
- جدید دور کے تعلیمی تقاضوں کو دین اسلام کے اصول کے تابع لانے کی ضرورت ہے تاکہ یہ قوم اپنے دینی تشخص کے ساتھ ابھر سکے۔ اور اس کے لیے علامہ اقبال کے کلام سے استفادہ کرنا چاہیے۔

- نوجوان نسل کی کردار سازی کے لیے اقبال کے افکار کو عام کرنے کی ضرورت ہے تا کہ نوجوانوں کو ایک رہبر کی زبانی اپنے اعلیٰ اقدار کی اہمیت اور ان کے تحفظ کا علم ہو اور ان میں عمل کی قوت پیدا ہو۔ اور امت کی اصلاح کا کام ہو۔
- اقبال کی طرح ہمیں قرآن حکیم اور احادیث کی تعلیمات کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہر فرد چاہے وہ عام شہری ہے یا منصب قیادت پر فائز اپنی زندگی کا لازمی جز بنانا چاہیے۔
- ہمیشہ سے مضبوط معیشت رکھنے والی قوم ہی دنیا میں نمایاں مقام حاصل کرتی ہے۔ جبکہ غربت اور معاشی کمزوری و محرومی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ اقبال نے بخوبی قومی زندگی میں اقتصاد کی اہمیت کو بیان کیا ہے ان کی نثری تصنیف "علم الا قتصاد" کو نصاب کا حصہ بنانا چاہیے۔
- علامہ نے مغرب کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی و معاشرتی نظام کے نقائص کو نظم و نثر میں نمایاں کیا ہے۔ جو کہ انسانیت کے حقیقی ارتقا کے لیے ایک رکاوٹ ہیں۔ لہذا ایک بہترین انسانی معاشرے کے قیام کے لیے اقبال کے کلام کو ہر سطح پر تعلیمی نصاب کا حصہ بنانے کی ضرورت ہے۔
- ان سفارشات پر عمل درامد کرنے کے لیے صرف سرکاری یا نجی اداروں کی توجہ ہی درکار نہیں بلکہ ہر بندہ انفرادی طور پر خود اور اپنے متعلقین کو علامہ اقبال کے افکار کے ذریعے اسلامی تعلیمات سے جوڑے۔ کیونکہ قومیں افراد سے مل کر بنتی ہیں۔

حوالہ جات

[1] ۔ محمد اقبال، بال جبریل، حصہ دوم، قطعہ، بزم اردو لائبریری ہ

[2] ۔ "لق ودق میدان ہے۔ ایک سفید کبوتر براق فضا میں چکّر لگا رہا ہے۔ کبھی تو اتنا نیچے اتر آتا ہے کہ بس اب زمین کی قسمت جاگی اور کبھی ایسی اونچائی پکڑتا ہے کہ تارا بن کر آسمان سے جڑ گیا۔ ادھر بہت سے لوگ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سب کے سب دیوانے ہو رہے ہ مگر وہ کسی کے ہاتھ نہیں آتا۔ کچھ وقت گذر گیا تو اچانک اس نے غوطہ لگایا اور میری جھولی میں آن گرا۔ آسمان سے زمین تک ایک قوس بن گئی۔ اس کے نتیجے میں اپنے دل کو اس یقین سے بھرا ہوا پایا کہ ان کا یہی بیٹا دین اسلام میں بڑا نام پیدا کرے گا۔"

[3] ۔ مختلف تاریخ دانوں کے مابین علامہ کی تاریخ ولادت پر کچھ اختلافات رہے ہیں لیکن حکومت پاکستان سرکاری طور پر 9 نومبر 1877ء کو ہی اقبال کی تاریخ پیدائش تسلیم کرتی ہے۔

[4] - خلیفہ عبد الحلیم، فکر اقبال، ص:30، بزم اقبال لاہور:1992

[5] - محمد اقبال، بانگ درا حصہ سوم، ص:252، نظم نمبر:122، والدہ مرحومہ کی یاد میں، اکتوبر1959

[6] - محمد اقبال، بانگ درا حصہ اول، ص:100، غزل نمبر:2، اکتوبر1959

[7] - جاوید اقبال، اسلام اور پاکستانی تشخص، اقبال اکادمی پاکستان لاہور:2008

[8] - محمد اقبال، بانگ درا حصہ دوم، ص:،140، نظم نمبر:73، عبد القادر کے نام، اکتوبر1959

[9] - محمد اقبال، بانگ درا حصہ دوم، ص:،119، نظم نمبر:55، طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام، اکتوبر1959

[10] - محمد اقبال، بانگ درا حصہ دوم، ص:،141، نظم نمبر:74، صقلیہ (جزیرہ سسلی)، اکتوبر1959

[11] - محمد اقبال، بانگ درا حصہ دوم، ص:،149، غزل نمبر:6، زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، اکتوبر1959

[12] - محمد اقبال، بانگ درا حصہ سوم، نظم نمبر:145، ص:303، طلوع اسلام، اکتوبر1959

[13] - محمد اقبال، بانگ درا حصہ سوم، نظم نمبر:85، ص:173، وطنیت، اکتوبر1959

[14] - محمد اقبال، بانگ درا حصہ سوم، نظم نمبر:85، ص:173، وطنیت، اکتوبر1959

[15] - محمد اقبال، بال جبریل، حصہ اول، غزل نمبر:18، ص:20، بزم اردو لائبریری

[16] - محمد اقبال، بانگ درا حصہ سوم، نظم نمبر:85، ص:174، وطنیت، اکتوبر1959

[17] - محمد اقبال، ضرب کلیم، سیاسیات مشرق و مغرب، گلہ، نظم نمبر:10، ص نمبر:265،

[18] - محمد اقبال، ارمغان حجاز، ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض، نظم نمبر:10، ص نمبر:265،

[19] - محمد اقبال، بانگ درا حصہ سوم، مذہب، نظم نمبر:133، ص:277، اکتوبر1959

[20] - سلیم چشتی، شرح ضرب کلیم، حصہ اول، توحید، نظم نمبر:13، ص:73، عشرت پبلیشنگ ہاوس لاہور

[21] - محمد اقبال، اسرار خودی، در بیان اینکہ خودی از عشق و محبت استحکام می پذیرد، شیخ غلام اینڈ سنز لاہور۔

[22] - سلیم چشتی، شرح ضرب کلیم، حصہ اول: نبوت، عشرت پبلیشنگ ہاوس لاہور

[23] - محمد اقبال، بال جبریل، حصہ اول، مسجد قرطبہ، نمبر:124، ص:91، بزم اردو لائبریری

[24] - محمد اقبال، بال جبریل، حصہ اول، مسجد قرطبہ، نمبر:124، ص:36، بزم اردو لائبریری

[25] - محمد اقبال، بال جبریل، حصہ اول، قطعات، ص:63، بزم اردو لائبریری

[26] - محمد اقبال، بال جبریل، حصہ اول، مسجد قرطبہ، نمبر:124، ص:92، بزم اردو لائبریری

[27] - محمد اقبال، بانگ درا حصہ سوم، زندگی، نظم نمبر:145، ص:288، اکتوبر1959

[28] - محمد اقبال، بانگ درا حصہ سوم، خضر راہ، نظم نمبر:144، ص:288، اکتوبر1959

[29] ۔ محمد اقبال، بانگ درا حصہ سوم، سلطنت، نظم نمبر:145، ص:288، اکتوبر1959

[30] ۔ محمد اقبال، بانگ درا حصہ سوم، سرمایہ و محنت، نظم نمبر:145، ص:288، اکتوبر1959

[31] ۔ محمد اقبال، بانگ درا حصہ سوم، سلطنت، نظم نمبر:145، ص:288، اکتوبر1959

[32] ۔ محمد اقبال، بانگ درا حصہ سوم، دنیائے اسلام، نظم نمبر:145، ص:288، اکتوبر1959

[33] ۔ محمد اقبال، بانگ درا حصہ سوم، دنیائے اسلام، نظم نمبر:145، ص:288، اکتوبر1959

[34] ۔ محمد اقبال، بانگ درا حصہ سوم، زندگی، نظم نمبر:145، ص:288، اکتوبر1959

[35] ۔ محمد اقبال، بال جبریل، حصہ اول، مسجد قرطبہ، نمبر:124، ص:92، بزم اردو لائبریری

[36] ۔ محمد اقبال، اسرار خودی، در بیان اینکہ خودی از عشق و محبت استحکام می پذیرد، شیخ غلام اینڈ سنز لاہور۔

[37] ۔ شاعری کی اصطلاح میں **تلمیح** سے مراد ہے کہ ایک لفظ یا مجموعہ الفاظ کے ذریعے کسی تاریخی 'سیاسی' اخلاقی یا مذہبی واقعے کی طرف اشارہ کیا جائے۔ تلمیح کے استعمال سے شعر کے معنوں میں وُسعت اور حسن پیدا ہوتا ہے۔ مطالعہ شعر کے بعد پورا واقعہ پڑھنے والے کے ذہن میں واضح ہو جاتا ہے۔
https://ur.wikipedia.org/wiki/%D8%AA%D9%84%D9%85%DB%8C%D8%AD

[38] ۔ **تمثیل:** جانسن کے لفظوں میں تمثیل سے مراد ایسا انداز بیان ہے جس میں اکثر غیر ذی روح اور غیر ذی عقل اشیاء کو جاندار بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اور ان باتوں یا افسانوں کی مدد سے انسان کے اخلاق و جذبات کا تزکیہ و اصلاح کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔

https://ur.wikipedia.org/wiki/%D8%AA%D9%85%D8%AB%DB%8C%D9%84

[39] کی اصطلاح میں جب کسی ایک شے کی کسی اچھی یا ۔ **تشبیہ** کا لفظ "شبہ" سے نکلا ہے جس کے معانی "مماثل ہونا" کے ہیں۔ علم بیان بری خصوصیت کو کسی دوسری شے کی اچھی یا بری خصوصیت کے معنی قرار دیا جائے تو اسے تشبیہ کہتے ہیں۔
https://ur.wikipedia.org/wiki/%D8%AA%D8%B4%D8%A8%DB%8C%DB%81

[40] ۔ استعارہ حقیقی معنی کا لباس عاریۃً لے کر مجازی معنوں کو پہنانا۔ مثلاً نرگس کہہ کر آنکھ مراد لینا۔ استعارہ تشبیہ سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ استعارہ میں صرف اس چیز کا ذکر ہوتا ہے جسکو استعارہ بنایا جائے جب کہ تشبیہ میں دونوں کا ذکر کیا جاتا ہے
https://ur.wikipedia.org/wiki/%D8%A7%D8%B3%D8%AA%D8%B9%D8%A7%D8%B1%DB%81

[41] ۔ محمد اقبال، بانگ درا حصہ، اول، بچے کی دعا، نظم نمبر:9، ص:19، اکتوبر1959

[42] ۔ سلیم چشتی، شرح ضرب کلیم، حصہ اول: مومن، عشرت پبلیشنگ ہاوس لاہور

[43] ۔ محمد اقبال، بال جبریل، حصہ دوم، نظم: لینن (خدا کے حضور میں) ص:101، بزم اردو لائبریری

[44] ۔ محمد اقبال، تجدید فکریاتِ اسلام، لیکچر: علم اور مذہبی مشاہدہ، مترجم: ڈاکٹر وحید عشرت، ص:22، اقبال اکادمی پاکستان

[45] ۔ مولانا عبد السلام ندوی، اقبال کامل، ص:74، : دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، انڈیا

مصادر و مراجع

1- قرآن کریم

2- محمد اقبال، بانگ درا: اکتوبر 1959

3- سلیم چشتی، شرح ضرب کلیم، پبلیشنگ ہاوس لاہور

4- محمد اقبال، بال جبریل،، بزم اردو لائبریری

5- محمد اقبال، تجدید فکریاتِ اسلام،، مترجم: ڈاکٹر وحید عشرت، اقبال اکادمی پاکستان

6- مولانا عبد السلام ندوی، اقبال کامل، ص:74، : دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، انڈیا

7- محمد اقبال، اسرار خودی، شیخ غلام اینڈ سنز لاہور۔

8- محمد اقبال، ارمغان حجاز،،

9- جاوید اقبال، اسلام اور پاکستانی تشخص، اقبال اکادمی پاکستان لاہور: 2008

10- پروفیسر فتح محمد ملک، قبال کا فکری نظام اور پاکستان کا تصور، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور

11- خلیفہ عبد الحلیم، فکر اقبال، ص:30، بزم اقبال لاہور: 1992

12- ڈاکٹر خالد مبین، فکر اقبال کے روشن زاویے، بزم اقبال لاہور: 2018